مذہبی تصورات کا مبداء کیا ہے؟

رئیس العلماء مولانا سید کاظم نقوی مجتہد (علی گڑھ)

عام طور سے یہ سوال کرنے والے مادہ پرست اور منکرین خدا ہیں۔ انھوں نے مذہب اور خدا کے عقیدے کا سرچشمہ علم الاجتماع (Socialogy) اور علم النفس (Psychology) کے بعض محرکات کو قرار دیا ہے۔

مادہ پرست اس سوال کا جواب جو کچھ دیں لیکن ہمارے نزدیک خدا اور دوسرے ماوراء طبیعی (Metaphysical) امور کی طرف انسان کو خود اس کی فطرت نے متوجہ کیا ہے۔

یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے ہم دریافت کریں کہ انسان کس لئے مل جل کر زندگی بسر کرتا ہے؟ وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کو کیوں پسند نہیں کرتا؟ یا انسان میں جذبۂ حب ذات کب سے پیدا ہوا ہے؟ کس زمانے سے اس میں جنسی خواہشیں پیدا ہوئیں اور وہ شریک زندگی کی تلاش میں رہنے لگا؟ کب اس کے دل میں اولاد کی محبت نے جگہ پائی اور وہ اسے اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھنے لگا؟ ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ہے کہ ان امور کا سرچشمہ انسانی فطرت ہے۔ یہ میلانات انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ اسی لئے جب سے انسان ہے وہ ان چیزوں کی طرف مختلف صورتوں سے متوجہ رہا ہے۔

اس کے علاوہ خداوند عالم کی ذات کی طرف متوجہ ہونے کا ایک دوسرا قوی سبب بھی ہے جس کا اثر کسی طرح فطری سبب سے کم نہیں۔ یہ انسان کی عقل وفکر ہے۔ انسان نے یہ دیکھ کر کہ کوئی چیز بغیر علت کے وجود میں نہیں آتی ہے تھوڑے سے غور وخوض کے بعد طے کیا کہ خود اس کے وجود کے لئے، اس کے علاوہ کائنات عالم کے اس حیرت انگیز نظم وضبط کے واسطے جو ہر صاحب فہم کے سامنے ہے، کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہئے۔ اس نے اسی کا نام خدا رکھ لیا۔

دوسرے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ وہی جذبہ کہ جس کی تحریک سے انسان کی زندگی اور نیچر کے مختلف مظاہر کے بارے میں غور کیا۔ وہی جذبہ جس نے اسے آمادہ کیا کہ وہ مادے کے پیچیدہ اسرار، کائنات کے مستقل اور متغیر قانون کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، وہی جذبہ کہ جس نے علم ودانش کے شیدائیوں کو ابھارا کہ وہ عالم طبیعت کے حقائق کا پتہ چلانے کی خاطر زندگی اور اس کی لذتوں سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور اپنی عمر علمی مرکزوں اور صنعتی تجربہ گاہوں میں گزار دیں۔ اس پر اسرار جذبہ انسانی نے انسان سے کہا کہ وجود کے سرچشمہ کا پتہ چلانے کی کوشش کرے۔

جہالت اور نادانی سے مقابلہ، حقائق علم کے جاننے کے لئے کدوکاوش، جو چیزیں انسان کے علم ودانش کی دسترس سے باہر ہیں، انھیں معلوم کرنے کی آرزو انسان کے فطری گہرے احساسات میں سے ہے۔ انسان بہر صورت

فطرت کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے تقریباً اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

قدیم تاریخ کے مطالعے، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تغیرات کی تحقیق، انسانی علم و دانش کے ارتقاء کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی فطرت میں جذبۂ تلاش حق رچا بسا ہوا ہے۔ ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ اکثر و بیشتر علمی کاوشوں کے پس منظر میں ان مادی اور دنیوی فوائد کا حاصل کرنا مقصود تھا جو ان کی وجہ سے افراد یا اقوام کے پہنچنے والے تھے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تمام تحقیقات کا اصلی منبع انسان کا فطری جذبۂ تلاش تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہستی کی واقعیتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے ہاتھوں سے چھوے۔

تاریخ علم وصنعت بتا رہی ہے کہ انسان کا یہ فطری جذبۂ تحقیق جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ اس نے انسان کو ایسی خطرناک آزمائشوں پر آمادہ کر دیا جن میں ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ چاروں طرف سے خطروں میں گھر گیا، لیکن اس کے قدم کبھی رکے نہیں، وہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ اس نے اس راہ میں غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔

اگر چہ بچے عقل وفہم کے لحاظ سے پختہ اور کامل نہیں ہوتے، لیکن انسان کے اس فطری جذبے کے اثرات کو بڑے واضح طور سے ان کی زندگی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

بچہ گویا سوال اور جستجو کا ایک خوبصورت مجسمہ ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ماں باپ اور استاد سے مختلف چیزوں کے متعلق پوچھا کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ مطلب یہ ہے کہ بچہ اس سطحی اور معمولی ادراک پر ہرگز اکتفا نہیں کرتا ہے جو کسی آواز کے سننے یا کسی چیز کے دیکھنے کے بعد اس کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ بچے کے پے در پے اور غیر منظم سوالات بتاتے ہیں کہ اس کی فطرت علم کی پیاسی ہے۔ وہ جہالت اور ناواقفیت کو دور کر کے علم و دانش کے پانی سے سیراب ہونا چاہتا ہے۔

تہذیب کے بالکل ابتدائی زمانے میں بھی انسان ہرگز ہمارے زمانے کے چھ سات برس کے بچے سے عقل وفہم کے لحاظ سے کم نہ تھا۔ کیا وہ ان چیزوں کے بارے میں جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھیں اپنے دل میں پوچھتا نہ ہوگا کہ ان کے اسباب کیا ہیں؟

وہ دیکھتا تھا کہ کسی درخت سے پتے کا گرنا، کسی ٹہنی کا دفعتاً ٹوٹ جانا ہوا کے تیز و تند جھونکے کے چلنے کا نتیجہ ہے۔ اسے نظر آتا تھا کہ جو مکان ابھی ابھی صحیح و سالم اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا موسلا دھار بارش کی وجہ سے مسمار ہو گیا۔ ایسے ہی سیکڑوں واقعات دیکھنے کے بعد وہ ایک علمی اور فلسفیانہ نظریے کا معتقد ہو گیا کہ کوئی حادثہ، کوئی واقعہ اس عالم کائنات میں بے سبب اور بے علت نہیں ہے۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے یقینا یہ ناگزیر ہے کہ اسے اس دنیا کے خالق کی فکر پیدا ہو، جو وجود کا سرچشمہ ہے، جس کی قدرت کے اشارے سے یہ ساری کائنات پیدا ہوئی ہو۔

علوم وفنون کی تاریخ میں اب تک سیکڑوں مفروضات یکے بعد دیگرے دنیا کے سامنے آتے رہے ہیں، لیکن کچھ

عرصہ کے بعد وہ غلط ثابت ہوئے اور ان کی جگہ دوسرے مفروضات نے لے لی۔ یہ مسلّم ہے کہ ان صحیح یا غلط علمی فارمولوں کی طرف انسان کی توجہ کا اصلی سبب اس کا حقیقت طلبی کا جذبہ تھا۔ کوئی عالم اور سائنس داں ان علمی نظریات کی پیدائش کا عقلی اور فکری سبب کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نتیجہ نہیں قرار دیتا ہے۔

اگر ہم سب متفقہ طور سے علمی نظریات کی پیدائش کو اجتماعی اور نفسیاتی مخصوص اسباب کا نتیجہ نہیں سمجھتے تو کیوں اور کس لئے مبداء وجود اور خالق عالم کے تصور کے پیدا ہونے کے بارے میں ایسا سمجھتے ہیں۔

نفسیاتی یا اجتماعی علل واسباب کی احتیاج ان چیزوں کو ہے جن کی کوئی فطری علت اور فکری سبب نہ ہو۔ ایسی صورت میں علم الاجتماع یا علم النفس کو حق حاصل ہے کہ وہ اس خلاء کو بھرنے کے لئے اظہار خیال کرے۔ مثلاً بعض بے ہودہ خیالات کی پیدائش جس کا کوئی فطری یا عقلی سبب موجود نہیں ہے، انھیں ان علوم وفنون کا موضوع فکر بننا چاہئے۔ کچھ لوگ بعض جانوروں کو مبارک اور بعض کو منحوس سمجھتے ہیں۔ بے شک یہ ایسا عقیدہ ہے جس کا سرچشمہ علم النفس اور علم الاجتماع کو معلوم کرنا چاہئے، لیکن ایسے مسائل کو جو انسان کے باطن کا مطالبہ، اس کی خلقت کا تقاضا، اس کی فطرت کی صدا اور اس کے علاوہ عقلی اور فکری محرکات کا نتیجہ ہیں، وہ علم الاجتماع اور علم النفس کے دائرۂ حکومت سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق ان علوم کو اظہار خیال کا ہرگز حق نہیں ہے۔

چونکہ مادہ پرست (Meterialist) طبقہ خدا اور دوسرے مذہبی امور کے بارے میں غور نہیں کرنا چاہتا، وہ اپنے کو ان کی گرفت سے بچانا چاہتا ہے، اس لئے ان کے مقتضائے فطرت ہونے کا انکار کرتے ہوئے ان کے دوسرے اسباب و وجوہ تراشتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں علم الاجتماع اور علم النفس سے مدد لیتا ہے۔ اتفاق سے یہ طبقہ مذہب کی پیدائش کی توجیہ اور تفسیر کے بارے میں اتفاق نہیں رکھتا بلکہ مختلف لوگ اس کے گوناگوں ایک دوسرے (سے) مختلف اسباب وعلل بیان کرتے ہیں۔

کیا مذہب کا سرچشمہ خوف ہے؟

مثلاً نفسیات کے مشہور ماہر ''فرویڈ'' (Sigmund freud) کے نزدیک مذہب کو نیچر کی بے رحم طاقتوں سے انسان کا خوف وہراس وجود میں لایا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے:

''خلق کائنات کے متعلق ہمارے مذہبی عقیدے کا تعلق ہمارے بچپنے کی زندگی سے ہے۔ بچہ اپنے کو ایک عظیم جہاں کے سامنے عاجز اور بے سہارا محسوس کرتا ہے، تمام ان مبہم خطروں کے مقابلہ کے لئے جو دنیا میں بچہ کو دھمکاتے ہیں، ماں اپنے بچہ کی پہلی حامی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر طرح کے اضطراب کے عالم میں اس کی مددگار رہے۔ بہت جلد باپ ماں کی جگہ آجاتا ہے۔ تمام دور طفولیت میں یہ فریضہ باپ کے ذمہ رہتا ہے۔ بچپنے کا ڈر بالغ ہونے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ بالغ انسان ان تمام خطرات سے آشنا ہوتا ہے جن سے اسے ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ بچہ کے مانند دنیا کے مقابل ضعیف ہے۔ وہ جس طرح بچپن میں باپ کے پہلو میں پناہ لیتا اسی طرح زندگی کی دوسری منزلوں

میں کوئی محافظ اور پشت پناہ چاہتا ہے۔ بنابریں وہی باپ کہ جو بچپن میں اس کے نزدیک بے انتہا طاقت کا مالک تھا بعد میں الوہیت کا تصور بن جاتا ہے جو مافوق بشر ہے۔''

(فرویڈ اور فرویڈازم ص ۱۴۸)

اس دور کا ایک مورخ مذہبی عقائد کے پیدا ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: -

''خوف دیوتاؤں کو جنم دیتا ہے۔ خوف کہ فہرست میں موت سے ڈر کا درجہ سب سے اہم ہے۔ انسان حیات کے ابتدائی دور میں ہزاروں خطرات کے درمیان تھا اور بہت کم اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی شخص اپنی طبیعی موت سے مرے۔ اکثر بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے دوسروں کے جارحانہ حملوں کے نتیجہ میں یا مہلک بیماریوں کی وجہ سے دنیا سے چلے جاتے تھے۔ اسی بنا پر ابتدائی انسان یہ باور نہیں کرسکتا تھا کہ موت ایک طبیعی حادثہ ہے۔ اسی دلیل سے وہ ہمیشہ اس کے لئے مافوق طبیعیت علت تصور کرتا تھا۔

موت سے خوف، اتفاقی حوادث پر جن کی علت کا انسان پتہ نہیں چلا سکتا، حیرت وتعجب، دیوتاؤں کی امداد کی امید اور ان خوش بختیوں پر جو انسان کو حاصل ہیں شکر گذاری، یہ تمام امور اعتقادات دینی کے اسباب ہیں۔''

(تاریخ ایل ڈورینٹ، ج ۱ ص ۹۰-۸۹)

یہ سب ایک طرف اور بیسویں صدی کے عظیم المرتبت فلسفی اور رہنما برٹرنڈ رسل دوسری طرف جن کے اسم گرامی سے علمیت اور عظمت جھلکتی ہے، انھوں نے گویا فیصلہ کن بات کہہ دی ہے: -

''میں سوچتا ہوں کہ خدا اور دوسرے مذہبی امور کے عقیدے کی علت خوف ہے۔ چونکہ انسان ایک حد تک اپنے کو ناتواں دیکھتا ہے۔ تین چیزیں ہیں جو اس کے لئے موجبات خوف فراہم کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک نیچر ہے جو صاعقہ کے ذریعہ اس کے سر پر ضرب لگاتی ہے یا زلزلے کے ذریعہ اسے نگل لیتی ہے، دوسری چیز خود انسان ہے جو جنگ کے وسیلے سے اپنے بنی نوع افراد کو تلف کرسکتا ہے، تیسری چیز کا تعلق بہت زیادہ مذہب سے ہے۔ انسان کی شدید جنسی خواہشیں بھی اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ انسان زندگی کے سکون واطمینان کے لحظات میں اپنی بعض حرکتوں پر پشیمان ہوتا ہے۔ مذہب اس کا موجب بنتا ہے کہ انسان کے خوف ووحشت میں کچھ توازن واعتدال پیدا ہو۔''

(توضیح وبررسی مصاحبہ برٹرنڈ رسل۔ وایت ص ۱۲۱)

ان ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حوادث عالم کے مقابلہ میں نہتا، بے چارہ اور کمزور تھا۔ اس لئے وہ ان سے غیر معمولی طور سے خائف تھا۔ اسی خوف نے وجود خدا کا عقیدہ پیدا کیا ہے۔

انسان مہلک بیماریوں کا علاج نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا کہ نیچر کے بے رحم اور سنگدل ہاتھ افراد انسانی کو گروہ در گروہ ہلاک کررہے ہیں۔ وہ ان خوفناک حوادث کے مقابلہ میں نفسیاتی اضطراب کی وجہ سے مجبور تھا کہ کسی مبہم اور پراسرار ہستی کو اپنی پناہ گاہ قرار دے جو اس کے دہلتے ہوئے قلب کو سکون اور اطمینان عطا کرے۔

اس کے علاوہ زمان بلوغ اور اس کے بعد ایک منزل

تک انسان کی زندگی سہارا طلب تھی۔ اس نے ہمیشہ اس زمانے میں اپنے کوایک طاقتور شخص کی پناہ میں پایا۔اس نے اسے بہت سے خطرات سے بچایا۔ اس دور کی زندگی نے اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا کیا کہ وہ نیچر کی مہلک طاقتوں کے مقابلہ کے لئے ایک قابل اطمینان پناہ گاہ پیدا کرے۔ ایک وقت گذرنے کے بعد یہی پناہ گاہ خدا کے تصور اور عقیدے کی شکل میں نمودار ہوگئی ہے۔

یہ نظریہ کس حد تک صحیح ہے؟

مذاہب وادیان کی تاریخ مدوّن ہوچکی ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خیال مذہبی طبقہ پر ایک بہت بڑی تہمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس نظریہ کا اظہار کرنے والوں نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے علمی لب ولہجہ میں اسے بیان کیا ہے۔ خدا پرستوں کی طرف یہ تیر علم النفس کے ترکش سے سر کئے گئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کا یہ خیال ایک دعوائے بے دلیل ہے۔کوئی چھوٹی سی بھی دلیل وہ اس پر قائم نہیں کر سکتے ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا کہ علم النفس اور علم الاجتماع یا ان کے مانند دوسرے علوم کی مدد سے ایسے مسائل کے متعلق اظہار خیال کرنا محل نظر ہے جس کا کوئی داخلی، فطری اور عقلی سبب موجود نہ ہو، اس صورت میں بے شک بجا اور بامحل ہے کہ ان علوم کے ماہرین ان مسائل کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کریں اور ان کا نفسیاتی سبب نیچر کی بے رحم طاقتوں سے ڈر یا زمان طفولیت کے سہارا طلب ہونے کو قرار دیں۔ لیکن ایسے مسائل کی جن کا سبب فطری یا عقلی موجود ہو، پیدائش کی توجیہہ علم النفس یا علم الاجتماع سے کرنا بڑی ناانصافی ہے۔

فرائیڈ اور ان کے ہم خیالوں نے اپنے اس مفروضہ میں صرف یہی نہیں کہ خدا پرستی کے فطری ہونے سے آنکھیں بند کرلی ہیں بلکہ عقلی اور استدلالی خداشناسی سے بھی چشم پوشی فرمائی ہے جس کی بنیاد قانون علت ومعلول کے اوپر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ کچھ مسائل انسان کے اندرونی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پیدا ہونے کے سلسلے میں معقول رویہ یہ ہے کہ انسانی اسباب سے ابتدا کی جائے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا محرک خود انسان کی فطرت اور عقل تو نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ منزل ہے کہ ان کے واسطے اکتسابی، خارجی اور غیر انسانی اسباب قرار دیے جائیں۔

مثلاً بعض اعداد کو عوام الناس منحوس سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس عقیدے کی عقلی بنیاد نظر نہیں آتی۔ انسان کے باطنی میلانات میں اس کا محرک نہیں ملتا۔ تعقل ومنطق کی رو سے ہمیں ان کے اور دوسرے اعداد کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ہم بیرونی اسباب کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی اس خیال اور عقیدے کی پیدائش میں دخیل ہوسکتا ہے۔

اب ہم ان اسباب کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں جو انسان کی فطرت اور قوت، عقل وفہم کے دائرے سے باہر ہیں۔ لیکن مذہبی عقائد ایسے مسائل ہیں جن کے لئے فطری، طبیعی، عقلی، فکری اسباب موجود ہیں۔ وہ ان کی پیدائش کے لئے کافی ہیں۔

خدا پرستی کا مسئلہ انسان کے شادی بیاہ کے مسئلہ کے مانند ہے۔ انسان کی طبیعی خواہش، ذاتی میلان، فطری طلب ازدواج کی طرف عورت اور مرد کو متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد اس گفتگو کا محل نہیں ہے کہ کیوں اور کس لئے انسان کو شادی بیاہ کی فکر ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عقل اور فطرت خدا پرستی کے پیدا ہونے کا عظیم انسانی محرک ہے، بدیہی بات ہے کہ اس طرح کے داخلی اور فطری سبب کے ہوتے ہوئے دوسرے اسباب کی فکر غیر عاقلانہ اور غیر منصفانہ بات ہے۔ اس طرح کی کج روی ویسی ہی ہے کہ کوئی شادی بیاہ کے مسئلہ میں فطری اور طبیعی خواہش کے باوجود یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ انسان جب حسین وجمیل مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ خود اس کے گھر میں اس قسم کے منظر ہوں تاکہ ہر وقت انھیں دیکھ کر لطف اندوز ہو جس طرح پہاڑوں، بیابانوں میں انھیں دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ عورت بھی حسین وجمیل اور خوش منظر ہے۔ انسان نے چاہا کہ وہ بھی مجھ سے نزدیک رہے۔ اسی جذبہ نے اسے شادی بیاہ کے لئے آمادہ کیا۔

مسئلہ ازدواج میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کھیتی باڑی کے سامان کی شکل کو جب دیکھا تو اسے شادی کرنے کی فکر ہوئی۔ کیا مسئلہ ازدواج کا جب داخلی، انسانی، فطری محرک موجود ہے تو اس قسم کے دور از کار توجیہات نامعقول اور مضحکہ خیز نہیں ہے؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ خدا پرستوں کے طبقہ میں کس کس طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اگر یہ طبقہ صرف نادان، بے سود اور جاہل لوگوں پر مشتمل ہوتا، تو کسی حد تک معقول تھا کہ یہ کہا جائے کہ مذہب اور وجود خدا کا عقیدہ نیچر کی بے رحم طاقتوں سے ڈر کا پیدا کیا ہوا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس گروہ کے پیش رو علماء اور عقلاء میں وہ کہ جو صرف یہی نہیں کہ طبیعی طاقتوں کو جانتے ہیں بلکہ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان پر کیوں کر قابو پایا جا سکتا ہے، ان کو کس طرح نقصان کے بجائے فائدہ رسانی کے کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔

آیا واقعی کہا جا سکتا ہے کہ سقراط، افلاطون، ارسطو، ابن سینا، رازی، طوسی، ابن ہیثم، ہزاروں مشرقی اور مغربی خدا پرست اہل علم کا ایمان جو سب کے سب علوم وفنون کے بانی اور علمی اسرار ورموز کا انکشاف کرنے والے تھے عالم مادہ کے غیظ وغضب سے ہراس کا نتیجہ تھا؟

خدا پرستی کی تاریخ بتاتی ہے کہ خدا کو ماننے والے طبقہ نے ہمیشہ اپنے عقیدہ کی وجہ قوی اصول اور معقول دلائل کی روشنی میں بیان کی ہے۔

خدا پرست علماء کی طرف سے ہزاروں کتابیں خداوند عالم کے وجود اور دوسرے مذہبی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں، لیکن عام طور سے وہی علمی اور استدلالی طریقۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ کہیں بھی یہ بحث نظر نہیں آتی کہ نیچر کے قویٰ چونکہ سنگ دل اور بے رحم ہیں لہٰذا ان سے چھٹکارے کے لئے ایک عظیم الشان پناہ گاہ کی انسان کو ضرورت محسوس ہوئی، اسی کا نام خدا ہے۔

افلاطون نے حدوث عالم کو خالق کے وجود کی دلیل

قرار دیا ہے۔ ارسطو نے حرکت عمومی کے وجود کو وجود محرک کی نشانی جانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر طرح کی حرکت محرک کی محتاج ہے، عالم مادہ میں ہر چیز متحرک نظر آتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی ذات سے علاحدہ کوئی محرک ہو۔

یورپ کی علمی تحریک کے بعد علوم طبیعی کی ماہرین میں سے کچھ لوگوں نے مخصوص طرح کی دلیلیں قائم کر کے خداوند عالم کے وجود کو ثابت کرنا شروع کیا۔ مثلاً نیوٹن کہتا ہے کہ ایک دنیا کا کوئی مادہ ہرگز اس پر قادر نہیں ہے کہ رنگ برنگ کے موجودات پیدا کرے۔ یہ اختلاف وتنوع جو خلقت میں ہمارے سامنے ہے بتا رہا ہے کہ اس مادی سازوسامان کے پیچھے کسی قدرت کا ہاتھ ہے جس نے اس مادے میں تصرف کیا ہے۔

مصنوعی دماغ کا جب اس کی مشینری تیار کر چکا تو کہنے لگا کہ ایک مصنوعی دماغ جب بغیر انسانی عقل وتدبیر کے وجود میں آنے کے قابل نہیں ہے، تو سچ مچ کا اصلی دماغ جو اس مصنوعی دماغ سے لاکھوں گنا زیادہ پیچیدہ اور پراسرار ہے قطعاً کسی بنانے والے کا محتاج ہے۔

آیا ان واضح دلائل کے بعد جو علوم وفنون کے بانیوں نے پیش کئے ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوع انسانی کے درمیان خدا کے اعتقاد نیچر کی بے رحم طاقتوں سے خوف و ہراس کا نتیجہ ہے؟

آج بھی خدا پرست اہل علم جو خدا کے وجود پر ایمان راسخ رکھتے ہیں کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضبوط، مستحکم عقلی دلیلوں کی روشنی میں خدا کے معتقد ہیں۔ انھیں نیچر کی ظالم طاقتوں سے خوف وہراس نے خدا کے وجود کا قائل نہیں بنایا ہے۔ (جاری)

بقیہ مناجات واستغفار

پر حملہ کر دیا تھا اس وقت خود مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ مومنین پر مشتمل تھا اور دوسرا غیر مومنین پر۔ غیر مومنین کہہ رہے تھے: **''مَاوعدنا الله ورسوله الا غروراً''** یعنی ہم فریب کھا گئے ہیں۔ اسلام ہمارے امن وامان اور عزت کی حفاظت نہیں کر سکا۔ دوسری طرف مومنین کا گروہ تھا جو یہ کہہ رہا تھا: **''هذاماوعدنا الله ورسوله''** یعنی یہ وہی وعدہ ہے جو خود خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے کیا تھا۔ وعدۂ خدا اور رسول اس طرح واقع ہوتا ہے: **''انّ الّذین آمنوا یقاتلون فی سبیل الله والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت''** وہ لوگ جو مومن ہوتے ہیں راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے راہ طاغوت میں جہاد کرتے ہیں۔ اگر مسلمان میدان جنگ میں ڈٹا رہے اور خدا کی قدرت سے مایوس نہ ہو تو یقیناً فتح اسی کی ہوگی لیکن اگر مایوس اور پسپا ہو گیا تو وعدۂ خدا بھی بہرحال پورا نہیں ہوگا۔ پس اگر دشمن حملہ کر دے تو تعجب کا مقام نہیں ہے بلکہ یہ تو وعدۂ الٰہی ہے جو پورا ہو رہا ہے: **''هذاماوعدنا الله ورسوله وصدق الله ورسوله ما زادهم الا ایماناً وتسلیماً''**۔

★★★